حکمتِ اقبال (۳۵)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور فلسفۂ اخلاق (۲)

شیطان کی اہمیت

قرآن حکیم نے جبلّتی خواہشات کے حد سے متجاوز مطالبات کو ہویٰ (بُری خواہشات) کا نام دیا ہے اور مومن کو بتایا ہے کہ ہویٰ کو روکنے سے ہی وہ خدا کی محبت کے اس بلند مقام پر پہنچ سکتا ہے۔ جہاں وہ جنّت کا حقدار ہو جاتا ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○
فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ○ (النّٰزعٰت : ۴۰-۴۱)

(اور جو شخص اس بات سے ڈر جائے کہ اس نے خدا کے رُوبرو کھڑے ہو کر ہر نافرمانی کا جواب دینا ہے اور نفس کو بُری خواہشات سے روک لے' اس کا ٹھکانہ جنّت ہے!)

شیطان ہویٰ کے مطالبات کو طرح طرح سے حسین اور دلکش بنا کر پیش کرتا ہے لیکن اس کی یہ سب کارروائیاں فریبِ محض ہوتی ہیں۔ لہٰذا شیطان کی مخالفت خودی کی تربیت' ترقی اور تکمیل کے لیے ضروری ہے اور اس کے برعکس شیطان کی موافقت خودی کی ترقی کے لیے وبال ہے۔

رزم با دیواست آدم را کمال — بزم با دیواست آدم را وبال

قرآن بار بار شیطان کے فریب کا ذکر کرتا ہے اور اس سے بچنے اور شیطان کی مخالفت کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ اَعْمَالَهُمْ (النمل : ۲۴)

(اور شیطان نے ان کے لیے ان کے بُرے اعمال کو حسین بنا کر پیش کیا ہے)

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ اِلَّا غُرُوْرًا ○ (النساء : ۱۲۰)

© rasailojaraid.com

(وہ ان سے وعدہ کرتا ہے اور ان کو امیدیں دلاتا ہے۔ لیکن شیطان جو وعدے بھی ان سے
کرتا ہے محض فریب ہوتے ہیں)

خدا کی حکمت نے شیطان اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ مومن کی خودی کی مزاحمت کرے تاکہ مومن اپنی محبّت سے مجبور ہو کر اس مزاحمت کا مقابلہ کرنے کے لیے نیکی کی تمام اندرونی قوتوں کو جمع کرے اور ان کے زور سے شیطان کی مزاحمت کو توڑ کر آگے نکل جائے۔ ایسا کرنے سے مومن کی خودی اپنے ارتقاء کے ایک بلند تر مقام پر قدم رکھتی ہے اور ایک بے نظیر راحت اور لذّت محسوس کرتی ہے۔ خدا کے سچّے عاشق کو ایسی دنیا کے اندر رہنے میں کوئی لُطف محسوس نہ ہوتا جس میں اسے اپنے اور اپنے محبوب یعنی خدا کے دشمن کے ساتھ مقابلہ کر کے فتح یاب ہونے کا کوئی موقع نہ ملتا:

مزی در آں جہانے کور ذوقے ۔۔۔ کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

جنت میں شہداء جنّت کی ہر نعمت سے سرفراز ہونے کے باوجود یہ تمنا کریں گے کہ خدا انہیں پھر دنیا میں بھیجے تاکہ وہ اس راحت اور لذّت سے پھر بہرہ ور ہوں جو شیطانی قوتوں کو تباہ کرنے کے لیے جان تک کی بازی لگانے میں انہیں حاصل ہوئی تھی۔ گویا خدا کے عاشق کے لیے یہ وہ نعمت ہے جو جنّت میں بھی موجود نہیں۔ اقبال کی نظم "جبریل و ابلیس" میں ابلیس جن باتوں پر جبریل کے سامنے فخر کرتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر میں جرأت کر کے خدا کی نافرمانی نہ کرتا تو میں انسان کو تاقیامت گمراہ کرتے رہنے کی اجازت بھی نہ مانگتا۔ اور اگر مجھے یہ اجازت نہ ملتی تو خدا کی جستجو کے راستہ میں انسان کے لیے رکاوٹیں کون پیدا کرتا۔ اور اگر یہ رکاوٹیں نہ ہوتیں تو انسان جو محض ایک مشتِ خاک ہے اس کی خودی اپنے ارتقاء کی ان بلند ترین منزلوں پر کیسے پہنچ سکتی جو ان رکاوٹوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر عبور پانے کی وجہ سے ممکن ہوتی ہیں۔ لہٰذا اگرچہ میں خدا کے حضور سے راندا گیا ہوں جو میری موت سے کم نہیں، لیکن میرا لہو قصّہ آدم کو رنگین کر گیا ہے۔ باغ آدم کی بہار، جس سے آدم میری مخالفت کر کے بہرہ ور ہو گا، کا دارومدار میری اپنی تباہی پر ہے۔ عقل و خرد کا لباس جو دورِ حاضر میں اکثر گمراہ انسانوں نے پہن رکھا ہے اور جس پر اُن کو فخر ہے اُس کا تار و پود میرے پیدا کیے ہوئے فتنوں سے بنایا گیا ہے۔ سب سے پہلے میں نے ہی عقل و خرد کی بنا پر خدا کے اس حکم کو محلِ اعتراض ٹھہرایا تھا کہ میں آدم کو سجدہ کروں۔

om

ہے مری جراَت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟

سچا مومن اپنی مخلصانہ محبت کی وجہ سے خدا کے خوف سے خدا کی ناراضگی کا خوف مراد لیتا ہے۔ وہ جسمانی تکلیفوں کی شکل میں خدا کے عذاب سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا خدا کی ناراضگی سے ڈرتا ہے۔ اس کے نزدیک اس سے بڑھ کر خدا کا عذاب اور کوئی نہیں ہوتا کہ خدا اس سے ناراض ہو۔ اسی طرح سے اس کے نزدیک خدا کی محبت جسمانی لذتوں کی صورت میں کسی انعام کی محبت نہیں ہوتی، بلکہ خدا کی رضامندی کی محبت ہوتی ہے۔ مومن کے نزدیک خدا کی رضامندی سے بڑھ کر کوئی اور انعام نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہر فعل کی بدنی سزا یا بدنی جزا فعل کے اندر موجود ہوتی ہے اور اس سے الگ نہیں ہو سکتی، تاہم جب کوئی شخص بدنی سزا کے خوف سے یا کسی بدنی راحت یا لذت کے طمع سے ایک بُرے کام کو ترک کر کے ایک اچھا کام کرتا ہے تو اس اچھے کام کی اچھائی ناقص رہ جاتی ہے۔ ایسے شخص کے نزدیک جو چیز ترک کے قابل ہوتی ہے وہ فعل کی بُرائی نہیں ہوتی بلکہ وہ بدنی تکلیف ہوتی ہے جو وہ سمجھتا ہے کہ فعل کی سزا ہو گی۔ اور جو چیز قبول کرنے کے قابل ہوتی ہے وہ فعل کی اچھائی نہیں بلکہ وہ بدنی راحت یا لذت ہوتی ہے جو اس کے خیال میں فعل کا انعام ہو گی۔ اچھا کام وہی ہے جو خدا کی محبت کے مقامِ کمال سے صادر ہو۔ محبت کے اس مقام پر یہ کام مومن کو اس لیے کشش کرتا ہے کہ وہ خود اسے زیبا نظر آتا ہے اور اس کی زیبائی کی محبت اور اس کے نقیض کی زشتی کی نفرت بے اختیار اس کے دل سے پیدا ہوتی ہے۔ صرف اس قسم کا اچھا کام ہی وہ اصلی فعلِ جمیل ہوتا ہے جس کی جزا مومن کو خدا کی پوری رضامندی کی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔

اقبال اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے۔

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے حور و خیام سے گذر، بادہ و جام سے گذر!

یہ ہے مختصر الفاظ میں روداد اور علمی اور نفسیاتی بنیاد اس معرکہ "خوب و ناخوب" کی جو "جہانِ خودی" میں برپا ہوتا ہے۔

محبت کی تشفی کا عمل

محبت ہمیشہ اپنے اظہار اور اپنی تسکین اور تشفی سے ترقی پاتی ہے۔ جس طرح سے ذکر خدا

© rasailojaraid.com

کی محبّت سے پیدا ہوتا ہے اور خدا کی محبّت کی تشفّی کا ایک عمل ہے اور خدا کی محبّت کو ترقی دیتا ہے، اسی طرح سے فعلِ جمیل بھی خدا کی محبّت کی تشفّی کا ایک عمل ہے اور خدا کی محبّت کو ترقی دیتا ہے۔ دراصل ذکر اور فعلِ جمیل دونوں خودی کی محبّت کو ترقی دے کر نکتۂ کمال تک پہنچانے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، کیونکہ دونوں خدا کی محبّت کے اظہار اور اس کی تسکین اور تشفّی کے طریقے ہیں۔ اگر کوئی شخص اچھے عمل سے بے پرواہ ہو جائے اور فقط ذکر ہی سے اپنی محبّت کو ترقی دینا چاہے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں اسے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا، کیونکہ اس کا ذکر اخلاص سے عاری ہو گا۔ اس کے برعکس وہ محبت کی منزلِ کمال سے ہر روز اور دُور ہوتا جائے گا۔ اس کی مثال اس مسافر کی طرح ہو گی جو دو گھنٹے کے لیے تو اپنی منزل کی طرف چلے اور پھر سارا دن اس سے عین مخالف سمت میں چلتا رہے۔ ایسا شخص منزل پر کیسے پہنچ سکتا ہے؟ محبّت کی ابتدا میں فعلِ جمیل ممکن نہیں ہوتا کیونکہ محبت کمزور ہوتی ہے اور غلط جبلّی خواہشات اور ان کے ماتحت راسخ شدہ عادات کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن جب ذکر سے محبّت کچھ ترقی کر جاتی ہے تو مومن اپنی محبّت کی قوّت سے اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کی خاطر اپنی غلط خواہشات کو کسی قدر روک کر صحیح قسم کے عمل کی طرف مائل ہو اور پھر اس صحیح عمل سے اس کی محبّت اور ترقی کرتی ہے جس کی وجہ سے اسے ذکر کے اندر زیادہ گہری توجہ اور زیادہ لذّت نصیب ہوتی ہے، اور ذکر محبت کو ترقی دینے کے لیے اور بھی مفید اور مؤثر ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ ترقی یافتہ محبت فعلِ جمیل کو اور آسان کرتی ہے اور ذکر اور فعلِ جمیل کا یہ تعاون جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ خودی کی محبّت اپنی بلندیوں کی انتہا تک پہنچ جاتی ہے، جہاں وہ فعلِ جمیل کا اکتساب کسی مجبوری سے یا کسی مشکل جدّوجہد سے نہیں کرتی، بلکہ اس لیے کرتی ہے کہ یہ اس کی محبّت کا ایک تقاضا بن جاتا ہے، جو اس کے دل کی گہرائیوں سے خود بخود اُبھرتا ہے اور جسے روکنا اس کے بس کی بات نہیں رہتی۔ محبّت کے درجۂ کمال پر پہنچ کر خودی کے لیے فعلِ جمیل سے رُکنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا کہ محبّت کی ابتدائی منزلوں میں فعلِ قبیح سے رُکنا۔ اس حالت میں مومن دین کے اوامر اور نواہی کو فقط دوسروں کی سند کی بنا پر ہی نہیں جانتا، بلکہ ان کو اپنے دل کی گہرائیوں کے اندر محسوس کرتا ہے۔ اب وہ ان پر کسی مجبوری سے نہیں، بلکہ ایک ایسی خواہش سے عمل کرتا ہے جس سے رُکنا اس کے اختیار میں نہیں ہوتا۔

فاش مے خواہی اگر اسرارِ دیں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ جُز بہ اعماقِ ضمیرِ خود مبیں!
گر نہ بینی دینِ تو مجبوری است ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است!

ظاہر ہے کہ اس مقام پر مومن کو کسی راہ نما کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ راہ نما کی عین مرضی کے مطابق وہ خود اپنی راہ نمائی کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

کہے نہ راہنما سے کہ چھوڑ دے مجھ کو! ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یہ بات راہرو نکتہ داں سے دُور نہیں

ایک مشکل کا حل

اب یہ بات غور طلب ہے کہ ایک طرف سے تو جب تک انسان کچھ عرصہ کے لیے متواتر فعلِ قبیح سے اجتناب اور فعلِ جمیل کا اکتساب نہ کرتا رہے اس کی محبّت ذکر و فکر میں مشغول رہنے کے باوجود ترقی کر کے درجۂ کمال پر نہیں پہنچ سکتی اور دوسری طرف سے جب تک اس کی محبت درجۂ کمال پر نہ ہو اس وقت تک فعلِ قبیح سے متواتر اجتناب اور فعلِ جمیل سے متواتر اکتساب تو درکنار وہ اپنے دل سے اور اپنے پورے احساس اور یقین سے یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکتا کہ فعلِ جمیل کیا ہے اور فعلِ قبیح کیا ہے اور کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خودی کی محبّت جب تک کمزور رہتی ہے متضاد قسم کے تصوّرات میں بٹی رہتی ہے، اور یہ تصوّرات خودی کے صحیح اخلاقی فیصلوں کو غلط کرتے رہتے ہیں۔ پھر اس مشکل کا حل کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خودی کے لیے ارتقاء کرنا اور محبّت کے درجۂ کمال پر پہنچنا ممکن ہی نہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی یا نفسیاتی سطحِ زندگی پر ارتقاء ہو ہی نہیں سکتا؟ لیکن یہ بات درست نہیں! خدا نے انسان کو ارتقاء کر کے اپنی حالتِ کمال پر پہنچنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا ہو نہیں سکتا کہ اس مشکل کا حل کارخانۂ قدرت میں موجود نہ ہو۔

دراصل یہ مشکل انسانی اور نفسیاتی مرحلۂ ارتقاء کے ساتھ خاص نہیں۔ زندگی کو اس سے پہلے حیاتیاتی سطحِ ارتقاء پر بھی ایسی ہی مشکل پیش آ چکی ہے اور زندگی نے وہاں اس کا حل پیدا کر لیا تھا۔ یہ مشکل ایسی ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ ایک طرف سے جب تک ایک جسمِ حیوانی مکمل طور پر تندرست اور توانا نہ ہو وہ امراض کے جراثیم کی کامیاب مزاحمت نہیں کر سکتا اور جب تک وہ کچھ عرصہ کے لیے امراض کے جراثیم کی کامیاب مزاحمت نہ کرتا رہے وہ تندرست اور توانا نہیں ہو سکتا۔ اس حیاتیاتی

© rasailojaraid.com

مشکل کا حل زندگی نے عمدہ اور صحت بخش قدرتی خوراک مہیا کر کے خود پیدا کیا ہے۔ اگر جسم عمدہ غذا جس میں مناسب مقدار میں حیاتین اور فلزات موجود ہوں کچھ عرصہ کے لیے استعمال کرتا رہے تو یہ ایک طرف سے صحت اور توانائی اور دوسری طرف سے امراض کے جراثیم سے حفاظت دونوں کی ضمانت ہے۔ اسی طرح سے انسانی اور نفسیاتی سطحِ ارتقاء کی مشکل کا حل کرنے کے لیے زندگی "نبوّت" کی صورت میں روحانی غذا کے طور پر ایک ایسی قدرتی تعلیم مہیّا کرتی ہے جسے قبول کرنے کے بعد انسانی خودی فعلِ قبیح اور فعلِ جمیل میں فرق معلوم کر کے فعلِ قبیح سے اجتناب اور فعلِ جمیل کا اکتساب کر سکتی ہے اور اس طرح سے اپنی محبّت کو فروغ دے سکتی ہے۔ نبوّت زندگی کا اپنا انتظام ہے کیونکہ وہ انسان کے اختیار سے باہر ایک مظہرِ قدرت ہے، جس سے زندگی اپنے اسرار کو خود منکشف کرتی ہے اور عملِ خوب و ناخوب کی گرہ کھولتی ہے۔

خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر
گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات!

کامل طور پر توانا اور تندرست خودی وہی ہے جس کی محبّت درجۂ کمال پر ہو۔ ایسی خودی فعلِ ناخوب کے مرض پرور جراثیم سے محفوظ رہتی ہے۔ اور اس کی توانائی کا باعث یہ ہوتا ہے کہ وہ نبوّت کے علم سے، جو نبی کی شریعت کی صورت میں اسے میسّر آتا ہو، بالالتزام صحت بخش روحانی غذا حاصل کرتی رہتی ہے۔ خودی کی غذا حُسن ہے۔ اگر نبی کامل ہو تو اس کی تعلیم کامل ہوتی ہے اور جس طرح سے کامل غذا کے اندر تمام حیاتین اور فلزات جن کی جسم کو ضرورت ہے موجود ہوتی ہیں، اسی طرح سے کامل نبی کی تعلیم ایسے تصورِ حُسن کی نشاندہی کرتی ہے جس میں حسن و کمال کی وہ تمام صفات جن کی آرزو خودی کر سکتی ہے موجود ہوتی ہیں۔ اور پھر اس کی تعلیم خوب و ناخوب اعمال میں فرق کر کے اس روحانی غذا کے استعمال کے طریقے اور مواقع بھی بتاتی ہے۔

انکشافِ حقیقت کا مقام

شروع میں مومن نبی کی شریعت کو سمجھنے کے بغیر اور اپنے آپ کو مجبور کر کے اور بڑی جدّوجہد کے بعد عمل میں لاتا ہے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ شریعت کے احکام کی عقلی توجیہہ کر کے اپنے

آپ کو مطمئن کرتا ہے۔ لیکن چونکہ نبی کی شریعت خودی کی فطرت پر مبنی ہوتی ہے اور خودی یا زندگی کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے۔

شرع مے خیزد ز اعماقِ حیات
روشن از نورش ظلامِ کائنات

لہٰذا جوں جوں شریعت کی پابندی کی وجہ سے مومن کی محبت ترقی کرتی جاتی ہے اس پر یہ حقیقت کھلتی جاتی ہے کہ یہ شریعت کوئی ایسی چیز نہیں جو اس سے غیر ہو یا اس کی فطرت سے بیگانہ ہو۔ اور آخر کار ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کی محبّت درجۂ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ یہاں وہ شریعت کے احکام کو ایک طاقتور اندرونی جذبہ کے ناقابلِ مزاحمت تقاضوں کے طور پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ ہر مومن کے لیے ضروری ہے کہ اپنی محبّت کو فروغ دے کر اس مقام کو پائے جب تک وہ اس مقام کو نہیں پاتا وہ نہ صرف دین کو ایک مجبوری سمجھتا ہے بلکہ خدا سے بھی دُور رہتا ہے۔

فاش مے خواہی اگر اسرارِ دیں
جز باعماقِ ضمیرِ خود مبیں
گر نہ بینی دینِ تو مجبوری است
ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است

جب مومن اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اُسے قرآن کا علم عطا کیا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قرآن کا علم جو بمصداق "بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ" (قرآن اُن آیات پر مشتمل ہے جو اُن لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم دیا گیا ہے) اُس کی فطرت میں رکھا گیا ہے، بیدار اور آشکار ہو جاتا ہے۔ پھر وہ قرآن کے احکام کو اپنے دل سے ابھرتا ہوا محسوس کرتا ہے اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن خود اس کی ذات پر نازل ہوا ہے۔ پھر وہ کتاب خوان نہیں رہتا بلکہ صاحبِ کتاب بن جاتا ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ قرآن کا قاری نہیں رہتا بلکہ خود ہی قرآن بن جاتا ہے جب تک مومن اس مقام کو نہیں پاتا کوئی بڑے سے بڑا مفسر بھی اسے قرآن کے رموز و اسرار سے آشنا نہیں کر سکتا۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

© rasailojaraid.com

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!

اس مفہوم کو اقبال نے اپنی نثر میں اور وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"مذہبی زندگی بالعموم تین ادوار میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ ان کو 'ایمان'، 'عقل' اور 'عرفان' کے ادوار کہا جاسکتا ہے۔ پہلے دَور میں مذہبی زندگی ایک نظم کی صورت میں نظر آتی ہے، جسے ایک فرد یا ایک پوری قوم کو ایک غیر مشروط حکم کے طور پر قبول کر لینا چاہیے۔ بغیر اس بات کے کہ انہوں نے اس حکم کی بنیادی حکمت یا مصلحت کو عقلی طور پر سمجھا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نقطۂ نظر کسی قوم کی سماجی اور سیاسی تاریخ میں بڑی اہمیت پیدا کرے، لیکن جہاں تک فرد کی باطنی ترقی اور توسیع کا سوال ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ نظم کی مکمل اطاعت کے بعد نظم اور اس کے جواز کے اصل منبع کی عقلی تفہیم کا دَور آتا ہے۔ اس دَور میں مذہبی زندگی اپنی بنیادیں ایک طرح کے مابعد الطبیعیات میں تلاش کرتی ہے۔ یعنی کائنات کے ایک ایسے نظریہ میں جو عقلی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہو اور جس میں خدا کا تصوّر بھی شامل ہو۔ تیسرے دَور میں مابعد الطبیعیات کی جگہ نفسیات لے لیتی ہے اور مذہبی زندگی حقیقت وجود کے ساتھ براہِ راست تعلق پیدا کرنے کی تمنا کرنے لگتی ہے۔

یہ ہے وہ مرحلہ جہاں مذہب، زندگی اور قوت کو جذب کرنے کا ذاتی معاملہ نظر آتا ہے اور فرد ایک آزاد شخصیت کا مالک بن جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنے آپ کو قانونِ شریعت کی بندشوں سے آزاد کر لیتا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ معلوم کر لیتا ہے کہ قانونِ شریعت کا اصل منبع اس کے اپنے شعور کی گہرائیوں میں ہے۔ جیسا کہ ایک مسلمان صوفی نے کہا ہے: خدا کی کتاب کو سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ مومن کے دل پر اس طرح سے نازل نہ ہو جس طرح سے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔"

(صفحہ ۱۸۱ "تشکیلِ الٰہیاتِ جدید")

com